محمد اکرام چغتائی

اقبال اور ٹیگور☆

(تقابلی مطالعے کی نئی جہتیں)

تقابلی جائزہ خواہ کسی بھی نوع کا ہو، عام طور پر ناپسند ہی کیا جاتا ہے، لیکن بعض معاملات میں، خصوصاً ادبیات کے شعبے میں ایسا تقابل یا موازنہ کرنے کا رجحان بڑا علم آموز اور تعلیمی ذریعہ بن جاتا ہے جس کی افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شخصیات کا باہمی مقابلہ اور ان کے اختلافات کا جائزہ کسی بھی تجزیہ نگار کے لیے ہمیشہ ایک مشکل اور محنت طلب کام ہوتا ہے۔ اور اگر ان شخصیات کا دو مختلف ثقافتوں سے تعلق ہو تو یہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن عظیم اذہان کی تفہیم کے لیے یہ ایک ناگزیر امر ہے۔ باہمی تقابل کا یہ کام محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) اور رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء-۱۹۴۱ء) جیسی قدآور ہستیوں کے معاملے میں اور زیادہ احتیاط طلب ہو جاتا ہے کیونکہ اپنے عہد کی دونوں عظیم شخصیتوں نے اپنے اپنے عوام کی معاشرتی، قومی اور سیاسی بیداری کے لیے بڑی لگن سے تگ و دو کی ہے اور لوگوں کے ذہنوں پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں عبقری اس برصغیر کی تقسیم سے بہت پہلے اس جہانِ فانی سے گزر چکے ہیں، پھر بھی ان کے خیالات آج بھی زندہ ہیں اور مقبولِ عام تصورات کو ابھارتے رہتے ہیں۔

ٹیگور پسند مصنفین کے برعکس ایسا اہم اور خوش آئند تقابلی مطالعہ اقبال پسند دانشوروں کے لیے ہمیشہ ایک دل پسند موضوع رہا ہے، جنھوں نے اقبال اور ٹیگور کے درمیان شاعرانہ، فلسفیانہ اور سیاسی جہتیں تلاش کرنے کی غرض سے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں تحقیقی کام

کیا ہے۔ دراصل ایسے مطالعاتی مضامین موجود ہیں جن میں اکثر اوقات مصنفین کے ذاتی رجحانات اور اپنے قومی ہیروز سے عقیدت کا میلان بھی پایا جاتا ہے۔ ان اصحاب کے تحقیقی جائزے کسی حد تک ہم عصر سیاسی حالات سے بھی بہت زیادہ متاثر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر ان تخلیقی مصنفین کو تنگ نظری، طبقاتی اور قومیاتی اصولوں کے پیمانے سے جانچنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کی جانبدارانہ اور تعصب پر مبنی جائزہ گیری سے تلاش و تحقیق کا وہ راستہ مسدود ہو جاتا ہے جس پر چل کر ان عظیم شاعروں اور فلسفیوں کے باہمی اور حقیقی تصورانہ اتفاقات کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے اکثر تجزیاتی مطالعات نے ان کے کئی فکری اور اسلوبی اختلافات کے ساتھ ساتھ بہت سی موضوعی اور معروضی نظریات کی باہمی مماثلتیں بھی اجاگر کی ہیں، لیکن اس طرح کی تحقیق جس میں ان کے گوناگوں متماثل پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے، اپنے قارئین کو محض غیر منطقی اور سطحی قسم کے نتائج اخذ کر کے پیش کرتی ہے۔ ایسی غیر متوازن رسائیوں پر انحصار کرنے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ موصوف ہستیوں کے اپنے ہی الفاظ میں بیانات پیش کر کے ایک حقیقی تصور نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے جس میں کسی طرح کی قومی، سیاسی اور مذہبی تعصّبات کی رنگ آمیزی نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب نے ٹیگور کو ایک اعلیٰ درجے کی ادبی شخصیت مان کر جو مقام دیا، اس سے وہ ساری دُنیا میں جانے پہچانے گئے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۱۳ء میں ان کو ادب کا نوبل پرائز ملا جو ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اقبال کو بین الاقوامی سطح پر اس قدر زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ اگرچہ بعض ہم عصر ذرائع اور مکتوباتی مواد سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب نے اقبال کو بھی ایک عظیم شاعر اور دانشور کے طور پر تسلیم کیا اور ٹیگور کے برابر عزت و تکریم کا مقام دیا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسا اُس وقت ہوا جب مؤخر الذکر کو نوبل پرائز دیا گیا۔ اُن دنوں کیمبرج میں ''ماڈرن ہسٹری آف انڈیا'' لکھنے کا منصوبہ بن چکا تھا اور سر تھیوڈور موریسن، ممبر کونسل سیکرٹری آف سٹیٹ، کی طرف سے اقبال کو اُردو ادب پر ایک باب تحریر کرنے کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول کر لی۔ اسی طرح ٹیگور سے بنگالی لٹریچر کا باب

لکھنے کو کہا گیا۔[۱]

اس کے فوراً بعد پہلی عالمگیر جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) کے دوران لندن یونیورسٹی میں انگلش کے پروفیسر اور برٹش اکیڈمی کے سیکریٹری سر اسرائیل گولانز (Sir Israel Gollancz) نے شیکسپیئر کی سہ صد سالہ برسی کے موقع پر ایک ضخیم کتاب ترتیب دی، جس میں دنیا بھر سے شیکسپیئر کے بارے میں مختلف زبانوں کے مضامین انگریزی ترجمے کے ساتھ جمع کیے گئے۔ اس شاندار مؤقر FESTSCHRIFT میں اقبال اور ٹیگور دونوں نے اپنی اپنی زبان (یعنی اُردو اور بنگالی) میں مضامین لکھ کر پیش کیے۔ اقبال کا شیکسپیئر کے لیے پیش کردہ شاعرانہ خراجِ عقیدت اگرچہ مختصر تھا لیکن وہ ٹیگور سے زیادہ فصاحت کا حامل تھا۔ اقبال کے ایک قریبی دوست نے اس کا اعتراف کیا ہے۔[۲]

ان دونوں عظیم ادبی اور علمی شخصیتوں کا تعلق ایک ہی زمانے سے تھا اور ستم ظریفی دیکھیے کہ ہم عصر ہونے کے باوجود کبھی انہوں نے ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کی۔ حتیٰ کہ ان کے باہمی رابطے کا کوئی تحریری ثبوت بھی کہیں دستیاب نہیں۔ ٹیگور نے البتہ ایک دفعہ لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران اقبال سے ملاقات کرنے کی کوشش کی تھی جس کے لیے ان کے مشترکہ دوست عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی کی فرمائش تھی، لیکن اقبال ان دنوں لاہور سے باہر تھے، اس لیے ان سے ملنا ممکن نہ تھا۔ اسی دوست کے نام ٹیگور نے اپنے ایک خط (مورخہ ۷رفروری ۱۹۳۰ء) میں ان نقادوں کے بارے میں سخت نکتہ چینی کی تھی کہ وہ لوگ خواہ مخواہ دونوں کا باہم مقابلہ اور موازنہ کر کے محض وقت ضائع کرتے ہیں۔ اُنہوں نے زور دے کر کہا: واقعہ یہ ہے کہ اقبال اور میں (یعنی ٹیگور) دونوں اپنے اپنے طریق پر زندگی میں خوبصورتی اور سچائی کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں اور ہمیں اچھے دوستوں کے طور پر ہی سمجھنا چاہیے۔[۳]

مزید برآں، اقبال جب تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تو اپنے پرانے دوست سیّد امجد علی کے ساتھ سفر کر رہے تھے تو جہاز پر اتفاقاً مشہور ہندوستانی ماہر طبیعیات سی وی رامن سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ ان کو بھی نوبل انعام ملا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں ان

کے ہم سفر نے ٹیگور کی بین الاقوامی شہرت کے بارے میں سوال کیا تو اقبال نے کہا کہ ''ٹیگور آرام وسکون'' کی تلقین کرتا ہے لیکن زندگی عمل کی گزارتا ہے۔ جبکہ اقبال آرام وسکون سے بسر کرتا ہے لیکن تبلیغ عمل کی کرتا ہے۔[۴]

علاوہ ازیں پاکستان کے ایک دانشور سفارت کار ڈاکٹر افضل اقبال نے ٹیگور سے اپنی ایک ذاتی ملاقات کی تفصیل لکھی ہے جو انہوں نے ایک نوجوان راوین کے طور پر شانتی نکیتن میں کی تھی۔ اقبال کے بارے میں ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک متعلقہ اقتباس قابلِ ذکر ہے:

''وہ چونکہ پہلے سے یہ جانتے تھے کہ میرا تعلق لاہور سے ہے، لہٰذا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم پنجابی زبان میں بھی لکھتے ہو؟ میں نے اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے ساتھ ہی نادانی سے یہ بھی کہہ دیا کہ پنجابی کوئی زبان نہیں، بلکہ ایک مقامی بولی ہے... ٹیگور واضح طور پر یہ جواب سن کر ناخوش سے ہوئے... پھر کہنے لگے کہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اقبال نے پنجابی زبان میں کچھ نہیں لکھا بلکہ صرف اُردو اور فارسی میں ہی لکھتے رہے۔ اگر انہوں نے لکھنے کے لیے پنجابی کو اختیار کیا ہوتا تو یہ ایک مؤثر اور زوردار زبان بن چکی ہوتی... اقبال کو مضبوطی اور طاقت کی ضرورت کا بیحد احساس تھا اور انہوں نے انسان کی فطرت میں مردانگی اور شجاعت پر بہت زیادہ زور دیا۔ وہ ایک پُرجوش جہادی تھے۔ تاہم وہ امن وسکون کی قدر و قیمت کے بھی معترف تھے۔[۵]''

یہ خیالات اس لائق ہیں کہ ان کا جامع تجزیہ کیا جائے جس سے آگے مزید تقابلی مطالعے کی راہ ہموار ہو۔ ان تمام تصوراتی اور نظریاتی اختلافات کے علی الرغم ٹیگور نے اقبال سے ایک دِلی تعلق ضرور قائم رکھا جس کا اظہار ان کے ارسال کردہ دو پیغامات سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پیغام انٹرکالجیٹ مسلم برادر ہڈ[۶] کو بھیجا گیا جس نے ۹ر جنوری ۱۹۳۷ء کو یومِ اقبال کا انعقاد کرنا تھا اور دوسرا پیغام اقبال کی وفات پر ان کا تعزیت نامہ ہے۔[۷] ان پیغامات میں ٹیگور نے کھلے دل سے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا کہ وہ ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی شاعری کو دنیا

بھر میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ ٹیگور کی ادبی اور سیاسی تحریروں کا انگریزی ترجمہ اب بھی اقبال کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ٹیگور کی تحریروں سے علمی حد تک یقیناً متاثر تھے۔[۸] ان کی یہ دلچسپی موروثی طور پر ڈاکٹر جاوید اقبال میں بھی موجود ہے جو اپنے زمانۂ طالب علمی میں ٹیگور کو بہت پسند کرتے تھے اور ان کے ڈراموں کو ترجمہ کر کے سٹیج پر پیش کرنے کا شوق بھی رکھتے تھے۔[۹]

ٹیگور کے لیے مختلف علمی و ادبی سوسائٹیوں اور شخصیتوں کی طرف سے بہت سے القابات تجویز کیے گئے تھے، جن میں سے ایک ''انڈین گوئٹے'' بھی تھا۔ یہ لقب غالباً پہلے پہل البرٹ شوائٹزر[۱۰] نے ایک پیغام میں استعمال کیا جس کو ۱۹۵۲ء میں نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ ٹیگور کی شہرت بعض یورپی ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ البتہ جرمنی میں ان کا تعارف نوبل پرائز ملنے کے بعد ہوا۔ ٹیگور کی مشہور کتاب گیتا نجلی (گیتوں کے نذرانے) کے ایک شروع کے جرمن ترجمے نے جرمنوں کے دل اپنی طرف مائل کر لیے، جن کو ہندوستانی علوم وفنون سے پہلے ہی دلچسپی تھی اور انہوں نے ٹیگور کی شاعری میں ایک نیا عبقریانہ آہنگ دریافت کر لیا تھا۔ جرمن قوم نے جنگ کے دوران جو مصیبتیں برداشت کی تھیں، اس کی وجہ سے ان کو ٹیگور کے کلام میں بڑی تسکین ملی کیونکہ اس نے عالمی امن وامان اور انسانیت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ بہرحال مشرق اور مغرب کے درمیان پُل باندھنے کے لیے ٹیگور نے جو انتھک کوششیں کی تھیں، ان سے مجموعی طور پر جرمنوں کو بڑی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۱ء تک ٹیگور کی تیرہ چودہ کتابوں کا جرمن زبان میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ جرمن قوم کو ان کی غنائیہ شاعری اور فلسفے کے ساتھ جو رغبت تھی، وہ اس کے بعد بھی قائم رہی اور ابھی تک اس میں کمی نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں ٹیگور نے جرمنی کے یکے بعد دیگرے دورے کیے (۱۹۲۱ء، ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۰ء)۔ اکثر جرمن دانشوروں سے ان کے ذاتی روابط قائم تھے۔ ان باتوں سے بھی باہمی تعلقات اور دلچسپی میں بے حد اضافہ ہوا۔[۱۱]

جیسا کہ ٹیگور کے حالاتِ زندگی سے پتہ چلتا ہے، ان کو خود اوائلِ عمر سے گوئٹے کے کلام سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے شروع دور کے ادبی مضامین اور مقالات میں (جو ۱۸۷۸ء

میں شائع ہوئے) ایک اینگلوسیکسن لٹریچر پر اور دوسرا اینگلو نارمن لٹریچر پر ہے، تیسرا دانتے اور چوتھا پیٹرارک کے متعلق ہے اور پانچواں مقالہ گوئٹے کے بارے میں ہے اور ہر ایک کے ساتھ چند تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ٹیگور نے اپنی سوانح عمری میں ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ایک خاتون مشنری کی مدد سے جرمن زبان سیکھنے کے لیے کیں۔ اس خاتون کو بھی اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ شاگرد نے اتنے تھوڑے عرصے میں اس زبان پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اُنہوں نے اس حد تک جرمن سیکھ لی تھی کہ اب وہ ہائنرخ ہائنے کی تحریروں کے علاوہ گوئٹے کی مشہور کتاب 'فاؤسٹ' کو بھی براہِ راست جرمن میں پڑھ کر سمجھ لیتے تھے۔ ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ 'فاؤسٹ' کو اصل زبان میں ہی پڑھ رہے ہیں۔[۱۲]

ٹیگور نے اپنی نثری تصنیفات میں گوئٹے کا اکثر جگہ حوالہ دیا ہے۔ لیکن یہاں انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے کے چند حوالہ جات کا اختصاراً ذکر کیا جاتا ہے۔ اوّلین حوالہ Chinnapatra سے ملتا ہے جس کا نہ صرف نام ہی بلکہ اس کی رسائی سے بھی گوئٹے کی Zerstreute Blaetter (بکھرے پتے) کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کے ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء تک کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی بعض عبارتوں میں گوئٹے کے بارے میں ٹیگور کے مشاہدات کا تذکرہ ہے۔ دوسرا حوالہ ٹیگور کی نظم ''اُروشی'' ہے (۱۸۹۶ء کا خط) جس میں گوئٹے سے کچھ خاص تصوراتی مماثلتیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان میں پائے جانے والے تمام ظاہری مشترکات کو Weltliteratur (عالمی ادبیات) اور Weltbund (دولتِ مشترکہ) کے تصور سے تقویت پہنچتی ہے، جن میں ٹیگور اپنے جرمن مثنیٰ کے ساتھ حصہ داری کے حامل ہیں۔

ٹیگور ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے انیسویں صدی کے اختتام سے پیشتر گوئٹے کو اس برصغیر میں متعارف کرانے کے لیے پہلے پہل کوشش کی۔ اقبال بھی اپنے پیشروؤں کی ادبیاتی روایت سے متاثر ہوئے اور ان کو اپنی اوائل عمری میں ہی گوئٹے سے واقفیت حاصل ہوئی۔[۱۳]

ہم عصر حقائق کی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ شروع میں اس جرمن شاعر کی ذات سے اقبال کی دلچسپی محض ادبیاتی نوعیت کی تھی اور کسی حد تک فلسفیانہ بھی، لیکن انگلستان اور جرمنی میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران وہ گوئٹے کے تصور کی اس لامتناہیت سے پورے طور پر مسحور ہو چکے تھے، جو کہ اُن کی کتاب 'فاؤسٹ' کی کردار نگاری سے ظاہر ہوتی ہے۔ اقبال اور ٹیگور دونوں گوئٹے کے اس ضخیم ادبی شاہکار سے بے حد متاثر تھے اور ان کی شاعری کے لیے اس کو ایک بنیادی تخلیقی سرچشمے کی حیثیت حاصل رہی۔ لیکن اگر ان کے Weltanschauung یعنی عالمی نقطۂ نظر کا سرسری جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال زندگی بھر اس کی تخلیقی شجاعت اور اسلوبی ہنرمندی کے سحر سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ پھر اس غنائیہ ڈرامے کے ایک کردار میفسٹوفیلیز نے بھی اقبال کو بیحد متاثر کیا۔ یہ کردار وہ ہے جو ہمیشہ شر کی طرف مائل رہتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ہمیشہ خیر کا پہلو نکلتا ہے۔ میفسٹو نے بُرائی کے نمائندے کے طور پر اقبال کی شاعری اور فلسفیانہ سوچ میں شیطان کا تصور تشکیل دینے میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے اور یہی تصور پھر ان چند برگزیدہ صوفیا کی تاویلات میں بھی ملا جلا نظر آتا ہے جو اس کو خدا کی توحید کا مخلص تسلیم کنندہ گردانتے ہیں[۱۴] ٹیگور کی تحریروں میں 'فاؤسٹ' کی اندرونی روح کی وہ گہری بصیرت نظر نہیں آتی جو اقبال کے ان شعری مجموعوں میں پیش کردہ منظر کشی میں جھلکتی ہے۔

گوئٹے سے اقبال کو جو تعلقِ خاطر رہا، اس کا ایک دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ بتدریج اسلامی مشرق کے عظیم ادبی خزینوں کی طرف متوجہ ہوئے اور یوں رسولِ اکرمؐ سے ان کا عقیدتمندانہ رجحان بڑھتا گیا۔ یہی وہ روّیہ ہے جو اٹھارہویں صدی کے یورپ میں پھیلے ہوئے مذہبی تعصبات کے تناظر میں بالکل ناپسند کیا جاتا تھا۔ اقبال کی ادبی دسترس کے یہ دونوں پہلو اُن کی تیسری فارسی کتاب 'پیامِ مشرق' میں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ یہ کتاب گوئٹے کے اس غربی شرقی دیوان (West-Oestliche Divan) کے جواب کے طور پر لکھی گئی جو گوئٹے نے دراصل دیوانِ حافظ کے جرمن ترجمے سے متاثر ہو کر مرتب کیا تھا[۱۵]

ٹیگور کے خاندانی پس منظر نے اس کو حافظ کا صحیح معنوں میں عاشق بنا دیا[۱۶] لیکن اس

کے احترام اور جذباتی وابستگی نے اس کی تخلیقی عبقریت کو ہرگز متاثر نہ کیا، بلکہ اس کے بجائے وہ کالی داس کی 'شکنتلا' جیسے ہندوستانی لٹریچر کے منتخب شاہکاروں کے متعلق گوئٹے کی تحسین و تعریف کو زیادہ اہمیت دینے لگے[۱۱]۔ اقبال کے دل میں گوئٹے کے لیے جو تحسین و تکریم تھی وہ ان کی کتاب 'پیامِ مشرق' میں درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اقبال کے بارے میں یہ بجا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے گوئٹے کو نہ صرف اسلامی مشرق کے علمی ادبی حلقوں میں متعارف کرایا بلکہ عمومی طور پر برصغیر کے اہلِ ادب اور دانشمندوں سے بھی ان کو روشناس کرایا۔ اس تناظر میں ''انڈین گوئٹے'' کے لقب کے بارے میں لازماً ازسرنو غور کرنا چاہیے۔ (انڈین گوئٹے کہلانے کا مستحق کون ہے؟)

ادبی ایوارڈ اہلِ علم کی اہلیت کو ثابت کرنے کے لیے ناگزیر تو نہیں ہوتے۔ لیکن پھر بھی جن کو نوبل انعام کا حق دار ٹھہرایا جاتا ہے، وہ گویا اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کو عالمگیر سطح سے قبولیت اور شناخت کا موقع ملا ہے۔

ٹیگور جس کو بطور ایک اینگلو انڈین شاعر کے لٹریچر کا نوبل انعام ملا تھا، وہ تاحال جنوبی ایشیا کا واحد مصنف ہے، جس نے اپنی بنگالی تصنیف 'گیتا نجلی' کو رواں اور دلکش انگریزی زبان میں منتقل کیا جو عملی طور پر ایک نئی تخلیق کے روپ میں ڈھل گئی۔ ٹیگور کی یورپ میں شخصی موجودگی، دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی ان کی استثنائی قابلیت اور اپنی تشہیر کی صلاحیت، ان سب باتوں نے ان کو برطانیہ کے علمی ادبی شرفاء اور دانشوروں کے طاقتور حلقے کے قریب آنے میں مدد دی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوش قسمتی سے ان کو سر ولیم روتھن شٹائن سے جو جرمن نسل کا ایک معروف مصور تھا اور اس جیسی کئی بااثر شخصیتوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کا موقع مل گیا۔ اس مصور کے ساتھ بعد میں اقبال نے بھی خط و کتابت کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ وہ ٹیگور کی شاعری سے بیحد متاثر ہوا، جس کا انگریزی میں ترجمہ خود شاعر نے کیا تھا۔ اور پھر معاً بعد اس مترجم شاعری کو ڈبلیو بی ییٹس کے ملاحظے کے لیے بھجوا دیا جو اس کی شاعرانہ گہرائی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان حضرات کی پُرجوش تحسین اور مسلسل کوششوں سے ٹیگور کی شاعری نے مغرب

میں خاصی مقبولیت حاصل کی اور پھر وہ بین الاقوامی شہرت کی بدولت ادبیات کی دنیا میں نوبل لاریٹ بن جانے میں کامیاب ہوئے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان سے باہر کے لوگ ٹیگور کو اتنا نہ جان پاتے اگر اس کو یہ انعام نہ ملا ہوتا۔ اور اس سے پہلے اگر اس کے کلام کا یورپی زبانوں میں ترجمہ نہ ہو چکا ہوتا۔ اس عالمگیر شہرت نے ٹیگور پر خاصا نفسیاتی اثر ڈالا جس نے اس کو ان اندرونی ہچکچاہٹوں سے نجات دلائی جو ان کو احساسِ کمتری میں تقریباً محصور کیے ہوئے تھیں اور جو لوگوں کی تنقید کا سامنا کرنے سے گھبرا جاتے تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ ہوا کہ اب ان کے اپنے لوگ بھی ان کو تسلیم کرنے لگے اور ان کی شاعری کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی مقبولیت ملک بھر میں پھیل گئی اور معاشرتی نسلوں کے بارے میں ان کے نظریات کو بھی اہمیت دینے لگے حالانکہ اس سے پیشتر وہ ان کی طرف شاید اتنا دھیان نہ دیتے تھے۔

جن دنوں ٹیگور نے یہ ایوارڈ حاصل کیا، اس دور میں اقبال اپنی پہلی فارسی کتاب 'اسرارِ خودی' کی تکمیل میں مصروف تھے جس میں انہوں نے بڑے اہتمام سے اپنے مذہبی اور سیاسی فلسفے کی تشریح کی تھی۔ یہ کتاب دو سال بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد آر اے نکلسن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا جو ۱۹۲۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔ اس کا نام تھا: The Secrets of the Self۔ فاضل مترجم ایک معروف مستشرق تھے جو اسلامی ادبیات اور صوفی ازم کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھ چکے تھے۔ ہیگل کے جدید فلسفے کے مشہور استاد پروفیسر میک ٹیگرٹ کے شاگرد کے طور پر اقبال جب کیمبرج میں قیام پذیر تھے تو وہاں پروفیسر نکلسن سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ جس میں انہوں نے باہمی دلچسپی کے مختلف موضوعات پر تادیر تبادلۂ خیال کیا۔[۱۸] اس میں کوئی شک نہیں کہ نکلسن ہی وہ پہلا مغربی تھا جس نے اقبال کی عظمت کو پہچانا اور اپنے اس ترجمے اور تبصروں کی مدد سے اقبال کو مغرب میں روشناس کرایا۔ 'پیامِ مشرق' کے بارے میں ان کے اکثر تبصرے جرمن زبان کے مشہور جریدے 'اسلامیکا' میں ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن پروفیسر نکلسن کی مساعی مغربی

دانشوروں میں زیادہ تر انفرادی حد تک ہی محدود رہیں اور ان کو ڈبلیو بی ییٹس جیسے کسی تخلیقی مصنف یا پھر سر ولیم روتھن شٹائن جیسے کسی معاشرتی اور تحقیقی دانشور کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہوسکی جو اپنے اثر ورسوخ سے ان کی مقبولیت میں اضافہ کرتے۔ سر روتھن شٹائن نے اپنی کتاب Men and Memories میں لکھا ہے کہ ''جب اقبال ۱۹۳۱ء میں انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن آئے تو ان کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ ان کو اس بات کا کچھ ملال ہوا کہ کسی بھی انگریز فلسفی کو لندن میں ان کی موجودگی کا شاید پتہ ہی نہ تھا۔[۱۹] اقبال کے بعض حامیوں کا خیال ہے کہ نکلسن سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ 'اسرارِ خودی' کا ترجمہ کر دیں تاکہ اس کو ایوارڈ کی غرض سے سویڈش اکیڈمی کی نوبل کمیٹی کے ملاحظے کے لیے پیش کیا جا سکے۔ ان نقادوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سر ذوالفقار علی خان کی کتاب A Voice from the East (۱۹۲۲ء) اسی مقصد کو آگے بڑھانے کی خاطر شائع کی گئی تھی۔ اقبال کے قریبی ساتھیوں کو ان کتابوں کے لیے ایسے کسی محرک کو تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ البتہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اقبال کے کئی دوستوں کی یہ خواہش ضرور تھی کہ ان کو نوبل ایوارڈ مل جائے جس سے وہ اپنے بہت سے معاشی مسائل کو حل کر سکیں۔[۲۰] شیخ عبدالقادر نے اقبال پر اپنی نامکمل انگریزی کتاب میں ان کے ہم عصر شاعروں پر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اکثر دوستوں نے اقبال سے اصرار کیا کہ وہ بھی ٹیگور کی طرح یہ ایوارڈ حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن ان کو اس بات کا قائل کرنا آسان نہ تھا۔[۲۱] ایک اور روزنامچہ نویس نے اقبال کے بارے میں اپنی ذاتی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بہت سے بہی خواہ 'پیامِ مشرق' کا ایک مصور ایڈیشن شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کو لازماً نوبل پرائز مل جائے گا۔[۲۲] اسی طرح بعد میں 'جاوید نامہ' کو بھی رنگین تصاویر سے مزین کر کے شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔[۲۳] لیکن افسوس ہے کہ ایسی کوئی بھی جذباتی تمنا مناسب منصوبہ بندی اور عزمِ صمیم کی کمی کے باعث پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ طالب علموں نے اقبال سے دریافت کیا کہ ٹیگور کو نوبل پرائز دے کر عزت افزائی

کی گئی ہے۔ اور آپ ابھی تک حاصل نہیں کر سکے۔ ایسا کیوں ہے۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ اگر مجھے یہ پرائز ملا ہوتا تو پھر مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں کونسی کامیابیوں کی وجہ سے اس کا مستحق ٹھہرا ہوں مگر چونکہ مجھے اس ایوارڈ سے نوازا نہیں گیا، لہٰذا یہ سوال غیر ضروری ہے۔[۲۴]

ایوارڈ کا ملنا کوئی ایسا پیمانہ بھی نہیں کہ اس سے کسی نابغۂ روزگار ہستی کی عظمت کو جانچا جا سکے۔ البتہ اس سے بین الاقوامی اور بے شمار دنیاوی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ انعامات دینے میں جو مقصدیت پائی جاتی ہے اس کے باوجود ایک بات تو طے ہے کہ ایوارڈ دینے یا نہ دینے کے مسئلے پر عموماً اختلافات اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اقبال کے پیرو اور قریبی دوست ٹیگور کے نوبل ایوارڈ لینے پر تنقید کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کے حصول کی دو ایک بار ناکام کوشش بھی کر چکے تھے۔ اقبال کی آرام طلبانہ عادات اور کسی طالع آزمائی سے جی چرانے کا میلان بھی اس ناکامی کے ذمہ دار ہیں۔ تاہم ٹیگور کا ایوارڈ زندگی بھر ان کے ذہن پر سوار رہا اور وہ براہِ راست یا بالواسطہ اس ایوارڈ کے الجھاؤ سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔

ٹیگور کی دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ان کو ۱۹۱۵ء میں نائٹ کا خطاب دیا گیا جو ادب میں ان کی خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف تھا لیکن وہ اس اعزازی خطاب کو زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکے۔ جنگ کے بعد ہندوستان کے انگریز حکمرانوں نے ملک میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہونے والی جدوجہد کو کچلنے کے لیے ظالمانہ اقدامات کیے۔ ان میں سے نمایاں مثال جلیانوالہ باغ امرتسر کے جلسے کی ہے جہاں ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو نہتے شہریوں پر اندھا دھند گولیاں برسائی گئیں اور سینکڑوں آدمی فوج کے ہاتھوں بیدردی سے مار ڈالے گئے۔ اس وحشت ناک سانحے کی خبر تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے دوسرے علاقوں میں پہنچی تو ملک کے طول و عرض میں خوف و ہراس کی لہر پھیل گئی۔ اس دہشت ناک جبر و استبداد سے ٹیگور نے برطانوی پارلیمنٹ کی اس واقعے کے متعلق لاتعلقی اور سرد مہری کا رویہ دیکھ کر ٹیگور کو بڑا دُکھ پہنچا اور انہوں نے سانحۂ امرتسر کی زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انہوں نے نہ صرف

نائٹ کا خطاب واپس کر دیا۔ بلکہ بے خوفی سے ایک ایسے وقت میں حکومت کی پُرزور مذمت کی جبکہ ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے پوری قوم کا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہندوستان کی انگریز حکومت کے خلاف مظاہرے کرنے والے ہندوستانیوں کو وحشیانہ انداز سے ہلاک کیا گیا تو ٹیگور نے اس پر بھی شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ انہوں نے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے نام اپنے تاریخی خط میں واضح طور پر اس وحشیانہ اقدام پر اپنے دلی رنج والم کا اظہار کیا۔ پنجاب کی اس وقت کی حکومت نے جو مسلسل ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس پر عوام کو ہمدردی کا احساس ہوا۔ انہوں نے لکھا کہ ہمارے لوگوں کے دلوں میں ان زیادتیوں سے وسیع پیمانے پر مایوسی و بے دلی پھیلی ہے اور ہمارے حاکموں نے سنگدلانہ سردمہری کا اظہار کیا ہے، شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ انہوں نے عوام کو خوب سبق سکھایا ہے اور وہ اپنے آپ کو غالباً مبارکباد بھی دیتے ہوں گے۔ لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ حکومت سے ملنے والے خطاب، تمغے وغیرہ عزت افزائی کے بجائے ہمارے لیے شرمندگی اور بدنامی کا باعث بن گئے ہیں[۲۵] لہٰذا انہوں نے وائسرائے سے درخواست کی کہ مجھے نائٹ کے خطاب سے فارغ کر دیا جائے۔ حکومت نے اس بات کو ماننے سے انکار کرنا چاہا مگر وہ اپنے مطالبے پر اصرار کرتے رہے اور آخر کار خطاب کو استعمال کرنا چھوڑ دیا۔ سانحۂ جلیانوالہ باغ امرتسر کی برسی (۱۳/اپریل ۱۹۲۰ء) کے موقع پر بمبئی کے اجلاس کے نام اپنے تحریری پیغام میں ایسے ہی مذمتی ریمارکس کا اظہار کیا جس کے لیے محمد علی جناح نے ان سے درخواست کی تھی جو اس وقت گرم جوش کانگریسی تھے۔

نائٹ کے خطاب سے ٹیگور کی دستبرداری کے کوئی تین سال بعد اقبال نے اس اعزاز کو قبول کر لیا اور کبھی اس کو مسترد کرنے کی بات نہ سوچی۔ حالانکہ پورا ملک برطانیہ کے خلاف سیاسی اکھاڑے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں مقبرہ جہانگیر کے مقام پر ایک شاندار تقریب منعقد کی گئی جس میں گورنر پنجاب سمیت کئی بیوروکریٹس اور شرفائے لاہور نے شرکت کی۔ حاکموں اور عالموں کے اس شاندار اجتماع میں نواب ذوالفقار علی خاں نے اپنی تقریر میں ٹیگور کے نوبل پرائز اور نائٹ کا خطاب لینے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ وہ تنہا شخصیت ہے جس

نے اس اعزاز کے لیے سب سے زیادہ بھاگ دوڑ کی تھی۔ اس تقریب میں اقبال نے بھی خطاب کیا اور اپنی آنے والی کتاب 'پیامِ مشرق' کے کچھ اشعار بھی پڑھ کر سنائے۔[۲۶]

انہوں نے بتایا کہ 'اسرارِ خودی' کے انگریزی تراجم اور تبصرے جو یورپی اور امریکی جریدوں میں شائع ہوئے تھے، وہی اس خطاب کا باعث بنے۔[۲۷]

اقبال نے نائٹ کا اعزاز وصول کیا تو مسلم اخبارات نے ان پر شدید نکتہ چینی کی اور ان کو نوآبادیاتی حکومت کا ایجنٹ قرار دیا جس سے کسی نے بھی تعاون کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔[۲۸] اقبال نے ایسے تمام الزامات کی سختی سے تردید کی لیکن ان کا یہ انکار مسلم عوام کو قائل نہ کر سکا۔ حال ہی میں اس واقعے کی ایک مختلف تاویل اقبال کے صاحبزادے نے پیش کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ اقبال کا تعلق ہندوؤں کے مقابلے میں اقلیتی گروہ سے تھا، لہٰذا اس خطاب کو قبول کرنے سے ان کی ایک دفاعی انداز کی نفسیاتی رسائی منعکس ہوتی تھی جو اس قسم کے طبقے کے ساتھ مخصوص تھی۔[۲۹]

ان تمام موشگافیوں اور وضاحتوں سے قطع نظر اس خطاب کا قبول کرنا اقبال کے سوانح نگاروں کے لیے اب بھی متنازعہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس ٹیگور کے حامیوں کو اپنے شاعر پر ناز ہے کہ اس نے اس خطاب کو جلد ہی مسترد کر دیا تھا۔

پہلی عالمی جنگ اور اس کے عواقب نے اقبال اور ٹیگور جیسے عظیم دانشمندوں کے پورے نقطۂ نگاہ کو بری طرح متاثر کیا لیکن ان کا ردِعمل ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اوّل الذکر کی رسائی 'پیامِ مشرق' میں اپنے عروج پر پہنچی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مغرب کے ساتھ مکالمہ کرنے کی غرض سے ایک خالص اور اصلی کوشش ہے جبکہ آخرالذکر نے مشرق اور مغرب کی مفاہمت کے لیے مخلصانہ جدوجہد کی۔ اس مقصد کے حصول کی غرض سے ٹیگور نے ۱۹۲۱ء میں اپنے شانتی نکیتن جیسے گوشۂ تنہائی کو ایک عالمی یونیورسٹی کی صورت میں ڈھالا۔ (وشو بھارتی: یاترا وشوم بھوتی ایکانڈم یعنی جہاں ساری مخلوقات کو اپنا ایک نشیمن مل جائے)۔ اس ادارے کے مقاصد یہ تھے:

(۱) ''انسانی ذہن کا اس احساس کے ساتھ مطالعہ کرنا کہ اس نے گوناگوں نقطۂ نگاہ سے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو کیسے اخذ کیا۔

(۲) مشرق کی مختلف ثقافتوں کا اُن کی تہ میں پوشیدہ وحدت کی بنیاد پر بردباری کے ساتھ مطالعہ اور تحقیق کر کے ان میں ایک دوسرے سے زیادہ قریبی تعلق قائم کرنا۔

(۳) ایشیا کی ایسی ہی زندگی اور فکر کی وحدت کو مدنظر رکھ کر مغرب سے رابطہ قائم کرنا۔

(۴) مشرق اور مغرب کو ملانے کی خاطر مشترکہ اور مربوط مطالعہ کرنا اور باہم دگر اتحاد کا احساس اجاگر کرنے کی کوشش کرنا جس سے آخر کار عالمی امن کی بنیادی صورتِ حال کو مضبوط و مستحکم کیا جا سکے، اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے دونوں نصف دنیاؤں کے درمیان آزادانہ فکری ابلاغ اور مواصلات کو عمل میں لانا۔''

اس کے علاوہ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ایک ایسا ثقافتی مرکز قائم کیا جائے جہاں مختلف مذاہب کے لوگوں یعنی ہندوؤں، بدھوں، جین مت والوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے عقائد، ادب اور تاریخ کے علاوہ ان کی سائنس اور آرٹ کا مطالعہ کر کے تحقیقی کام کیا جائے۔ اس کے ساتھ دوسری مشرقی تہذیبوں اور مغرب کے کلچر کو بھی زیرِ مطالعہ لایا جائے جس سے مشرقی اور مغربی ملکوں کے دانشوروں اور مفکروں کے درمیان تعاون اور انسانی بھائی چارے کی دوستانہ فضا قائم ہو اور باہمی سچے روحانی احساس کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں جس میں نسل، قومیت، عقیدے اور ذات پات کی کوئی قید نہ ہو بلکہ واحد اعلیٰ ہستی کے نام پر اور تمام تعصّبات سے پاک ہو...

ٹیگور نے خود شانتی نکیتن کا ذکر کرتے ہوئے اس کو اپنی ایک ''محسوس کردہ نظم'' اور ایک ایسی کشتی سے تشبیہ دی ہے جس میں زندگی بھر کا بہترین مال و اسباب لدا ہوا ہو۔ اس یونیورسٹی نے ان کے آبائی تعلیمی ادارے کو دنیا کے ثقافتی نقشے پر ایک ایسا متحرک مرکز بنا دیا، جس کا مقصد تعلیم کے حقیقی تصورات کو ذہن اور روح کی ثقافت سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ انہوں نے نسلی اور مذہبی اتحاد کو انسانیت کی ضرورت قرار دیا اور اس کے لیے بھی تگ و دو کی تا کہ الگ

الگ نسلوں اور عقیدوں کے عورت مرد آپس میں ایک دوسرے کے مختلف نقطۂ نگاہ کو سمجھ کر اور اس کو بنظرِ تحسین دیکھتے ہوئے ایک ایسا ماحول پیدا کریں جو باہم مخلصانہ دوستی اور بنی نوع انسان کی خیرخواہی پر مبنی ہو۔ اس نصب العین کو بروئے کار لانے کی غرض سے ٹیگور نے اسلام سمیت تمام بڑے مذاہب کے لیے الگ الگ شعبے قائم کیے اور اس طرح سے بین المذاہب مکالمے کے عمل کو ترقی دی۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں مطالعۂ اسلام کا مرکز قدرے تاخیر سے قائم ہوا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی مسلم ریاست یا متمول شخصیت کی جانب سے مناسب مالی امداد کا جلد انتظام نہ ہو سکا تھا۔[۳۰] یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مرحوم خلیفہ عبدالحکیم (۱۸۹۳ء-۱۹۵۹ء) جو اقبال کو اپنا 'پرانا گرو' مانتے تھے اور خود کو 'سر اقبال کا چھوٹا شنی' قرار دیتے تھے، اس آڑے وقت میں کام آئے اور انہوں نے اس مرکز کے قیام میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ غیر مطبوعہ مآخذ میں بیان ہوا ہے، غالباً ۱۹۲۵ء میں خلیفہ صاحب شانتی نکیتن میں ٹیگور سے ملنے گئے جہاں انہوں نے تفصیلی بات چیت کی۔ ٹیگور نے ان کو اس مجوزہ مرکز کی سربراہی کی پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے بوجوہ ہامی نہ بھری۔ بعد میں ٹیگور نے ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو خلیفہ صاحب کو ایک طویل خط لکھا (جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے) اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس مرکز کے لیے عطیات یا فنڈز فراہم کرنے کے سلسلے میں مدد دیں۔[۳۱] پھر دس ایک سال بعد خلیفہ صاحب نے اقبال کو مطلع کیا کہ ہندو بھی ایک اعلیٰ اسلامی مطالعات کا مرکز قائم کرنے کے خواہاں ہیں جس کے ثبوت کے طور پر میں رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک خط ساتھ ارسال کر رہا ہوں جو انہوں نے خاصا عرصہ پہلے میرے نام لکھا تھا کہ نظام حیدرآباد کی حکومت سے کہہ کر شانتی نکیتن میں مطالعۂ اسلام کا شعبہ قائم کروائیں۔ اس درخواست کے نتیجے میں وہ آخرکار نظام حیدرآباد سے ایک لاکھ روپے کا عطیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جس سے ان کی یونیورسٹی میں اسلامی مطالعات کا شعبہ قائم کیا گیا۔ ٹیگور نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہو تو یہاں آ کر اس شعبے کے سربراہ بن جائیں لیکن حالات سے مجبوری کی بنا پر میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کر سکا۔ لہٰذا وہ ایک یورپی مستشرق کو وہاں لے آئے جو اتنا عالم فاضل نہ تھا۔ پھر اس کے بعد فارسی کے

مشہور دانشور پورِ داؤد نے یہ منصب سنبھالا۔[۳۲]

یہ خلیفہ صاحب کی زندگی کا ایسا پہلو ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ پہلے انہوں نے نظام حیدر آباد دکن سے سلسلہ جنبانی کی اور پھر ان سے خاصی بڑی رقم گرانٹ کے طور پر حاصل کرنے کی غرض سے لگاتار تگ و دو کی اور کامیاب ہوئے۔ اس ضمن میں ان کو سر اکبر حیدری جیسے بااثر افراد کا تعاون بھی حاصل رہا۔ ۱۹۲۷ء میں اس مرکز کا افتتاح ہوا اور ہنگری کے ایک نومسلم دانشور عبدالکریم جرمانوس (۱۸۸۴ء-۱۹۷۹ء) کو اس کا پہلا چیئر مین مقرر کیا گیا۔[۳۳] جرمانوس نے پہلے عربی اور ترکی زبانیں سیکھنے کے لیے ویانا اور یورپ کی دیگر درسگاہوں میں داخلہ لیا اور پھر تعلیم مکمل ہونے پر ہندوستان چلا آیا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کر کے ان سے مدد حاصل کرنے کی استدعا کی۔ علامہ اقبال نے اس کی خاصی حوصلہ افزائی کی۔[۳۴] اس مرکز نے تفہیم اسلام کے لیے عمومی انداز کی کارکردگی دکھائی۔ اس کو کئی مشہور و معروف مذہبی شخصیتوں اور دانشوروں نے بڑی فراخ دلی سے تسلیم کیا ہے جن میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے اکابر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ وزیر اعظم ترکیہ بلند ایجوت پچھلے سال اس ادارے کا معائنہ کرنے گئے تھے۔ انہوں نے بھی اس کے بانی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔[۳۵]

سیر و سفر کی شدید خواہش کی بدولت بھی ٹیگور کو کئی ملکوں میں جانے کا موقع ملا۔ ۱۹۳۲ء میں جبکہ ان کی عمر ۷۱ سال ہو چکی تھی، وہ رضا شاہ پہلوی کی دعوت پر ایران گئے۔ سرکاری مہمان کی حیثیت سے ہر شہر میں ان کا پرجوش استقبال ہوا، خصوصاً شیراز میں جہاں ان کے اعزاز میں شاندار تقریب کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ وہ حافظ اور سعدی کے مقبروں پر اظہارِ عقیدت کے لیے گئے۔ اصفہان میں عظیم الشان اور رنگوں سے مرصع مساجد اور محلات کا معائنہ کرنے کے بعد وہ تہران پہنچے، جہاں ان کی بیحد عزت افزائی ہوئی۔ شاہِ ایران سے ملاقات ہوئی اور پھر وہیں ان کی بہترویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ وہیں ان کو ہمسایہ ملک عراق سے دعوت موصول ہوئی تو وہ بغداد چلے گئے جہاں شاہ فیصل نے ان کا استقبال کیا۔ ان

دونوں ملکوں کی بھرپور سیاحت اور سیر وسفر میں تقریباً دو مہینے لگ گئے۔[۳۶]

ٹیگور نے اس عرصے میں اپنی علمی ادبی مصروفیات کے علاوہ ایران میں تیزی سے وقوع پذیر ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کر کے ان کا تجزیہ بھی کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک نیم صنعتی ملک میں جو زیادہ تر جاگیردارانہ اور قبائلی معاشروں کا حامل ہے، وہ قوم پرست راہنماؤں کی بدولت اب تیزی سے جدید ملک بنتا جا رہا ہے۔ انہوں نے مشرق قریب کے عرب ممالک میں رائج طریقۂ تعلیم کو اپنا کر اپنے عوام کی شرح خواندگی میں خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ مذکورہ عرب ملکوں میں ان دنوں سرکاری زبان فرانسیسی تھی اور تعلیم و تدریس کا نظام بھی فرانسیسی طریقے سے ہوتا تھا جس کو ایران کے سرگرم قوم پرستوں اور ترقی پسندوں نے بڑی گرم جوشی سے اپنا لیا تھا۔

اقبال نے کبھی ٹیگور کے ادبی یا سیاسی نظریات پر کھلے بندوں تبصرہ نہیں کیا تھا، لیکن جب ایران کے عوام نے اور ایرانی حکومت نے بڑی گرم جوشی سے ان کی خاطر مدارات کی تو وہ لازماً ملول ہوئے۔ پھر جب ہندوؤں کے بڑے بڑے اخبارات نے ایران میں ٹیگور کی مصروفیات اور سرگرمیوں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا تو یہ بات بھی ان کو بہت شاق گزری۔ کئی سال پہلے انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ ایران کے خوشنما باغوں میں مٹرگشت نہ کریں۔ نیز ان کو مشورہ دیا تھا کہ اپنا رُخ عرب کی طرف موڑ لیں۔ ان کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ ایران میں مغرب کے اثرات تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں، جس سے وہاں کا معاشرتی ماحول بدل گیا ہے۔ انہوں نے ٹیگور کے ایرانی دورے کے بارے میں ہندو اخبارات کی رپورٹوں کا بڑی دقتِ نظر سے تجزیہ کیا۔ اور اس واقعے کو مغرب کی ثقافتی یلغار سے بھی زیادہ خطرناک پایا۔ انہوں نے اپنے ان نظریات کا اظہار ایک ایرانی دوست غلام عباس آرام کے نام اپنے انگریزی خطوط میں کیا تھا، جن کا ابھی حال ہی میں انکشاف ہوا ہے۔ یہ خطوط ۱۹۳۲ء کے موسم گرما میں لکھے گئے تھے، جب ٹیگور دورۂ ایران سے واپس آ چکے تھے۔ ایک خط میں جو ۲۷ر جون ۱۹۳۲ء کو بھیجا گیا، اقبال ٹیگور کے مشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''وہ ایران اس

لیے گئے کہ ہندوؤں اور ایرانیوں کے آریائی نسلی رشتوں کو استوار کریں... اس اثناء میں یہ پراپیگنڈا بھی سننے میں آیا کہ ایران زردشتی مذہب کو قبول کرنے کی طرف مائل ہے۔ اور ان دانشوروں کا اسلام دشمن طرزِ عمل عیاں ہے، جن کی تحریروں میں ایسی باتوں کے متعلق چبھتے ہوئے طنز پوشیدہ ہوتے ہیں...'' انہوں نے تحریک پین اسلام ازم کے خلاف ہندوؤں کے پراپیگنڈا پر بھی اعتراض کیا۔ ایک ایسے منصوبے کے طور پر جس کا کبھی کوئی وجود نہ تھا، سوائے ان لکھنے والوں کے ذہن میں جنہوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی جو محض یورپ کو اسلام سے ڈرانے کے لیے ایک تصوراتی خطرہ ہے۔ اس طویل خط میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''ٹیگور نے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ایک اور ناانصافی کی ہے۔ انہوں نے عراق کے مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کریں۔ سیاسیات کا ایک باخبر طالب علم بھی جانتا ہے کہ ''مکمل آزادی'' موجودہ حالات میں ہندوؤں کا مطالبہ نہیں اور نہ یہ ہوسکتا ہے۔ ان کا واحد نصب العین یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی اقلیتوں کی قسمت کے پورے پورے مالک بن جائیں۔ نیز وہ برطانوی سنگینوں کو صرف اپنے تحفظ کے لیے مخصوص رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہے وہ آزادی جس کا نقشہ ان کے ذہن میں ہے اور اس آزادی کا مطلب ہے محض ہندوستانی اقلیتوں کے آقاؤں کی تبدیلی۔''[۳۷]

ایران اور عراق کے دورے میں ٹیگور کی سیاسی تدبیر کاریوں پر اقبال نے جو شدید نکتہ چینی کی ہے، وہ ٹیگور کی ان دونوں مسلم ممالک میں کی گئی تقریروں اور بیانوں کے مضامین کے ساتھ منطبق نہیں ہوتی۔ اقبال کے تبصرے زیادہ تر ان رپورٹوں پر مبنی ہیں جو ہندوؤں کے اخبارات نے خوب مبالغہ آرائی کر کے یا توڑ مروڑ کر شائع کی تھیں۔ اقبال کے ایرانی دوست کو ان کی یہ سیاسی قیاس آرائیاں پڑھ کر بڑا تعجب ہوا اور اس نے ان کے وہ شکوک وشبہات دُور کرنے کی کوشش کی جو محض ہندوؤں کے اخباری پراپیگنڈے سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان دنوں انگریزوں کے تعلقات ایران سے بیحد کشیدہ تھے اور وہ اس کے بارے میں مقامی اخبارات میں چھپنے والی خبروں کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اپنے آخری خط

میں اقبال نے اعتراف کیا تھا کہ ممکن ہے بہت سے دیگر ہندوستانی مسلمانوں کی طرح انہیں بھی غلط اطلاعات ملی ہوں۔ لیکن وہ محض ایرانیوں کو غیر مسلموں کے طرزِ عمل کے بارے میں آگاہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اقبال نے ایک پارسی صحافی جی۔ کے۔ نریمان کے ساتھ بھی خط و کتابت کر کے اسے ٹیگور کے ارادے سے آگاہ کیا کہ وہ ہندوؤں اور پارسیوں کے درمیان ہم اصل اور ہم نسل ہونے کے رشتے پھر سے استوار کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس کہ اقبال اور نریمان کی باہم مکاتبت محفوظ نہیں رہی۔ البتہ فی الوقت نریمان کا ایک خط دستیاب ہوا ہے جس میں اس پارسی دانشور نے ٹیگور کے دورۂ ایران کو محض ایک لایعنی ڈرامہ قرار دیا ہے۔[۳۸] جہاں تک ہندوستان کی ''مکمل آزادی'' کا تعلق ہے، اقبال کے ۱۹۲۰ء اور مابعد کے خطوط میں بھی اسی طرح کے نظریات کا اظہار کیا گیا ہے۔

ایران اور عراق کے علاوہ کئی دوسرے عرب ملکوں میں بھی ٹیگور ایک علمی ادبی شخصیت کے طور پر مشہور ہے۔ ان کی بیشتر شاعری اور نثری کتابوں کے علاوہ کئی سوانحی اور تنقیدی مضامین کا عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں ٹیگور نے جو مصر کا دورہ کیا تھا، اس سے ان کو برگزیدہ سیاست دانوں اور علم و ادب کی دُنیا کے ممتاز دانشوروں میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس موقع پر مصری پارلیمنٹ کا ایک اجلاس ان کے اعزاز میں ملتوی کر دیا گیا تھا اور مصر کے وزراء نے ان کی عالمی یونیورسٹی (ویشو بھارتی) کے لیے عربی کتابوں کا ایک سیٹ بھی پیش کیا تھا۔ حکومت اور عوام دونوں کی طرف سے ٹیگور اور ان کے متعلقات کو جو اہمیت دی جاتی تھی، اس سے ہمارے ہاں سیّد ابوالحسن علی ندوی عرف علی میاں (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء) جیسے کئی دانشوروں کو بڑا رنج ہوتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں سیّد علی ندوی نے کوئی پندرہ سال کی عمر میں اقبال سے ملاقات کی تھی۔ وہ اقبال پر اپنی کتاب میں بڑے ملال کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں:

''ہمیں ان دنوں یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا تھا کہ ٹیگور کو عرب ملکوں میں اقبال سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ مصر اور شام کے کئی دانشور ٹیگور کے بڑے عقیدت مندوں میں شامل

تھے۔ ہم نے سوچا کہ ان ملکوں میں اقبال کو متعارف نہ کروا کر اس اضطراب انگیز صورتِ حال کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں جب ہم عربی زبان کے مجلّوں میں ٹیگور کی مدح سرائی پر مبنی مضمون پڑھتے ہیں تو ہمارے دل میں شدید جذبہ پیدا ہوتا کہ ہم اقبال کے کلام کو عربی میں ترجمہ کریں جو کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا اوّلین اور سب سے مقدم فریضہ ہونا چاہیے[۳۹]۔''

اس مقالے کو ختم کرتے ہوئے میں ذیل میں محمد علی جناح کا وہ تعزیتی پیغام پیش کرتا ہوں جو انہوں نے ٹیگور کی وفات (۱۹۴۱ء) پر ارسال کیا تھا:

''مجھے ہندوستان کے عظیم ترین شاعر، فلسفی اور انسان دوست کی وفات کی بُری خبر سن کر واقعی بہت افسوس ہوا ہے۔ مجھے اس بات کا شرف حاصل ہے کہ میں ان کو چھوٹی عمر سے جانتا تھا اور ۱۹۲۹ء میں ان سے میری آخری ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ اور یہ بھی میرے لیے ایک اعزاز تھا۔ ان کی بے تکلف خطیبانہ گفتگو سے سننے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ مخلص وطن پرست تھے اور مخالفین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور سراہنے کو ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے۔ انہوں نے گورکھی یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے معروف نعرے ''ہندوستان ایک ہے اور نا قابلِ تقسیم ہے'' کے متعلق اپنے اہم خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہر ہندوستانی کو اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شاعر ٹیگور کی موت ہندوستان کے لیے ایک نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کام اور اپنے کلام کے ذریعے ہمارے ساتھ زندہ رہیں گے[۴۰]۔''

حوالہ جات:

(☆) یہ مقالہ خلیفہ عبدالحکیم کی برسی پر ۳۰ر جنوری ۲۰۰۱ء کو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام میموریل لیکچر کے طور پر پڑھا گیا۔ اس کا انگریزی متن 'المعارف' کے سابقہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے، اب اس کا اُردو ترجمہ مع ترامیم و اضافات پیشِ خدمت ہے۔

(۱) اقبال بنام شاد، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۷۹-۸۰ (اقبال کا مکتوب بنام مہاراجہ کشن پرشاد، مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۱۴ء)

(۲) محمد افضل حسین کا آرٹیکل: My Preceptor، روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' (لاہور)، ۲۱ر اپریل ۱۹۶۱ء

(۳) سیارہ (لاہور)، خاص شمارہ ۳۲، اقبال نمبر، ۱۹۹۲ء، ص ۴۲۷-۴۲۸، مضمون از پروفیسر اکبر رحمانی

(۴) روزگار فقیر از فقیر وحید الدین، طبع عکسی، جلد اوّل، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۸

(۵) ڈائری آف اے ڈپلومیٹ (ایک سفارت کار کی ڈائری)، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۶-۲۷

(۶) روزنامہ انقلاب (لاہور) جلد ۱۲، نمبر ۲۲۰، (۱۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء)

(۷) دی انڈین ریویو (کلکتہ) مئی ۱۹۳۸ء

(۸) محمد صدیق: علامہ اقبال کی ذاتی لائبریری کی تفصیلی کیٹلاگ، لاہور، ۱۹۸۳ء، اشاریہ، (بزبانِ انگریزی)

(۹) ۱۹۹۸ء میں ۲۳ تا ۲۷ر نومبر کو والا لپور میں ''ٹیگور اور ایشیائی نشاۃِ ثانیہ'' کے حوالے سے جو بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں ڈاکٹر صاحب ''اقبال اور ٹیگور'' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کرنا چاہتے تھے، مگر وہ کانفرنس سیاسی وجوہ کی بنا پر ملتوی کر دی گئی۔

(۱۰) Die Weltanschauung der indischen Denker, Mystik und Ethic, Muenchen, 1935

(۱۱) Gisela Herdt: Rabindranath Tagore in German Literature (Visva Bharti Quarterly, 27, No. 34 (1961-62), pp. 260-274)

(۱۲) دیکھیے راقم کی کتاب ''اقبال اینڈ گوئٹے'' لاہور/اسلام آباد ۲۰۰۰ء، صفحات ۲۲، ۲۳، ۳۳-۳۴، Notes & Ref. نمبر ۸۷ اور ۱۳۱

(۱۳) ایضاً ''اقبال اینڈ گوئٹے''، مذکورہ بالا، ص ۲۵ تا ۵۳، حواشی اور حوالے نمبر ۸۹ تا ۲۱۶

(۱۴) ڈاکٹر جاوید اقبال: مئے لالہ فام (اُردو مضامین)، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۹ تا ۱۸۷

(۱۵) از جے فان ہاپر گشٹال دو جلدیں، شٹٹگارٹ/ٹیوبنگن ۱۳-۱۸۱۲ء

(۱۶) پیغام آشنا (اسلام آباد) جون ۲۰۰۰ء، ص ۲۰، مضمون از پروفیسر عبدالسبحان

(۱۷) اے داس گپتا: گوئٹے اینڈ ٹیگور، جائزہ شرقی غربی مکالمہ نئی دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۴-۲۹

(۱۸) اے جے آربری، اورینٹل ایسیز، یورنیٹس آف سیون سکالرز، لندن، ۱۹۶۰ء، ص ۲۱۴-۲۱۵

(۱۹) جلد III (۳۹-۱۹۳۰ء)، ص ۴۶

(۲۰) مولانا غلام رسول مہر کا خط بنام سیّد قدرت نقوی، مورخہ ۲۹ر جولائی ۱۹۵۹ء (رک، غالب آگہی مرتبہ سیّد قدرت نقوی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۳۹-۴۰، ۴۱-۴۲)

(۲۱) روزنامہ امروز (لاہور)، اقبال نمبر، ۲۱ر اپریل ۱۹۵۰ء، ص ۷

(۲۲) ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی: اقبال کی صحبت میں، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۱

(۲۳) ایم حنیف شاہد (مرتب): اقبال، چودھری محمد حسین کی نظر میں، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۰۱

(۲۴) روزگار فقیر، مذکورہ بالا، جلد اوّل، ص ۱۳۹-۱۴۰

(۲۵) ششی کمار گوش: رابندر ناتھ ٹیگور، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۵-۱۲۶

(۲۶) عبدالمجید سالک: ذکرِ اقبال، ''انکارِ خطاب'' کے تحت، تیسرا ایڈیشن، لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۷

(۲۷) شاد اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۲ء، ص ۱۳۵

(۲۸) ایم حنیف شاہد کا مضمون، مطبوعہ صحیفہ (لاہور)، اقبال نمبر، نومبر-دسمبر ۱۹۷۷ء، جنوری-فروری ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۳۸ تا ۱۵۱۔

(۲۹) ڈاکٹر جاوید اقبال: زندہ رود، جلد دوم، لاہور ۱۹۸۱ء، ص ۲۷۰

(۳۰) ''وِشو بھارتی اینڈ اِٹس انسٹی ٹیوشنز'' وشو بھارتی، شانتی نکیتن، دسمبر ۱۹۵۶ء، ص x، ۶۴

(۳۱) اقبال میوزیم (لاہور) میں محفوظ

(۳۲) مورخہ ۳ر اگست ۱۹۳۴ء، اقبال میوزیم (لاہور) میں موجود اندراج نمبر AIM-1977-369

(۳۳) دی مسلم ایسٹ سنڈیز ان آنر آف جولیس جرمانوس، بوڈاپسٹ، ۱۹۷۴ء، بایوگرافک ڈکشنری (فرانسیسی) پیرس، اپریل ۱۹۹۲ء، ص ۵۲، آرٹیکل از جی۔ لیڈرز

(۳۴) مکتوباتِ نیازی، مرتبہ سیّد نذیر نیازی، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۸۳

(۳۵) روزنامہ نوائے وقت (لاہور) ۴ر اپریل ۲۰۰۰ء

(۳۶) ڈاکٹر رضا مصطفوی: ٹیگور اینڈ ایران در: دانش (اسلام آباد)، شمارہ ۲۹، ۳۰، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰-۱۱

(۳۷) یہ چار خطوط ۲۰، ۲۷ر جون اور ۱۳ر جولائی ۱۹۳۲ء کو لکھے گئے۔ ''مکاتیبِ اقبال و عباس آرام'' از حسین علی نزاری۔ در: تاریخ معاصر ایران (تہران) جلد ۱، نمبر ۱، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۱ تا ۱۷۷

(۳۸) نریمان کا خط بنام اقبال (۱۱ر جولائی ۱۹۳۲ء)، خفیہ، مطبوعہ در: تاریخ معاصر ایران، مذکورہ بالا

(۳۹) نقوشِ اقبال اُردو، ترجمہ مولوی شاہ تبریز خان، کراچی، ۱۹۷۳ء، دیباچہ، ص ۳۴

(۴۰) ٹیگور کے پمفلٹ، جلد اوّل، مذکورہ بالا، ص ۹، جناح کی تقاریر وغیرہ کے جو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، ان میں یہ پیغام درج نہیں ہے۔